اقبالیات (اردو)

جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۲ء

مدیر:

پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۲ء)
مدیر	:	محمد منور
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	لاہور
سال	:	۱۹۹۲ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۵۳
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

مندرجات

جلد: ۳۲ | اقبالیات: جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۲ء | شمارہ: ۲

اقبالیات (اردو)

اقبال ریویو

جولائی تا ستمبر 1992

اقبال ریویو

مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان

یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر عملی تحقیق کے لیے وقف ہے۔ اور اس میں علوم و فنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے۔ جن سے انہیں دلچسپی تھی۔ مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، فن، آثاریات، وغیرہ

بدل اشتراک

پاکستان

قیمت فی شمارہ	30 روپے	
چار شماروں کے لیے	100 روپے	5 ڈالر 1.75 پونڈ

بیرونی ممالک

اداروں کے لیے	بشمول ڈاک خرچ	15 ڈالر سالانہ
فی شمارہ	بشمول ڈاک خرچ	۴ ڈالر

مضامین برائے اشاعت

معتمد مجلس ادارت، ''اقبالیات'' 27-F، ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے پر ہر مضمون کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں۔ اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہوگی۔

ناشر و طابع: اقبال اکادمی پاکستان۔ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور

اقبال ریویو

مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان

مجلس ادارت

شمارہ۲	جولائی تا ستمبر 1992ء	جلد۳۲

ترتیب

قلمی معاونین

پروفیسر ریاض حسین	استاد شعبہ انگریزی گورنمنٹ۔ایف۔سی۔کالج لاہور
پروفیسر محمد انور صادق	استاد شعبہ نفسیات گورنمنٹ کالج جڑانوالہ
محمد نذیر رانجھا	کتابدار ہجرہ کونسل اسلام آباد
ڈاکٹر وحید عشرت	معاون ناظم (ادبیات) اقبال اکادمی پاکستان لاہور
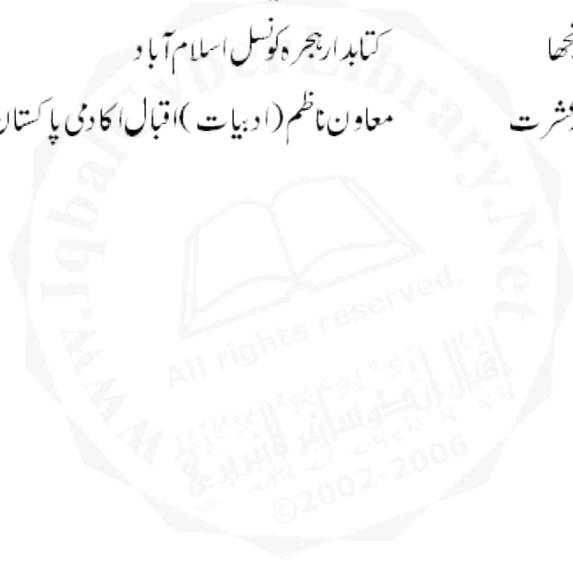
اقبالؒ کا ایک غیر مطبوعہ سہرا

پروفیسر ریاض حسین

"عرصہ ہوا قدر دان اقبالؒ کے مابین جب یہ علمی بحث کہ اقبال نے تاریخ گوئی کے علاوہ کسی کا سہرا بھی کہا یا نہیں، میری نظر سے گزری تو اسی وقت سے یہ خواہش تھی کہ اقبال کا کہا ہوا کوئی سہرا ہے تو اسے ڈھونڈنا چاہیے قسمت کی یاوری دیکھیے کہ حضرت علامہؒ کی سوانح پر تحقیق کے دوران گوہر مقصود ہاتھ آ گیا حضرت علامہ کے قلم سے نکلا ہوا یہ پہلا سہرا ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے سہرا پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر اور اس سے متعلقہ مباحث سے قارئین کو آگاہ کر دیا جائے۔"

علامہ اقبالؒ کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی رقم طراز ہیں:

"میں ایک مرتبہ مئی 1928ء میں علامہ اقبالؒ پر تحقیق کے ضمن میں، مظفر آباد (آزاد کشمیر) گیا تھا جناب جسٹس سجاد صاحب اور میاں محمد شفیع (م ش) بھی میرے ہم سفر تھے ایک صبح تفریح کے لیے ہم لوگ دریا کے کنارے بھی گئے تھے ایم عبدالرحیم افغانی بھی ہمارے ہمراہ تھے انہوں نے مندرجہ ذیل استفسار لکھا ہوا مجھے دیا تھا افسوس کہ افغانی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے بہر حال یہ بحث اقبالؒ کے ضمن میں بہت اہم اور علمی اعتبار سے ضروری ہے۔"

ان کا استفسار یہ تھا:

"ایک استفسار: بخدمت جناب علامہ چغتائی صاحب کہا جاتا ہے کہ علامہ

اقبال مرحوم نے کسی کی تاریخ وفات نہیں کہی اور نہ کسی کا سہرا لکھا، مگر اپنے استاد (مولوی میر حسن صاحب مرحوم) کی تاریخ وفات ''وما ارسلنگ الا رحمۃ للعالمین'' (آیہ) سے نکالی اور ایک کتاب (ذکر حبیب در احوال پیر حیدر شاہ صاحب جلال پوری) میں درج ذیل قطعہ وفات علامہ اقبال مرحوم کا کہا ہوا ملتا ہے۔''

ہر کہ برخاک مزار پیر حیدر شاہ رفت

تربت اور را امین جلوہ ہائے طور گفت

ھاتف از گردوں رسید و خاک او را بوسہ داد

گفتمش سال وفات او بگو، ''مغفور'' گفت

میں نے کافی تحقیق کی مگر کسی دوسری تصنیف میں یہ قطعہ نہیں دیکھا اس قطعے کے متعلق میں نے جناب ممتاز حسن، ڈاکٹر رفیع الدین اور فقیر وحید الدین صاحبان سے بھی استفسار کیا موخر الذکر نے جواب ہی نہیں دیا اول الذکر ہر دو دانشوروں نے بھی اس سے لاعلمی کا اظہار کیا کیا آنجناب اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے؟

والسلام

ایم عبدالرحیم افغانی مظفر آباد

11/05/86

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مجھے اقرار ہے کہ میں نے بھی مندرجہ بالا قطعے کو اقبالؒ کے ضمن میں کہیں نہیں دیکھا اور نہ کسی سے سنا ہے البتہ افغانی صاحب کے اس جملے "علامہ اقبال مرحوم نے کسی کی تاریخ وفات نہیں نہیں کہی اور نہ کسی کا سہرا لکھا" کا جواب میں نے ان کو اسی وقت دے دیا تھا یعنی یہ کہ علامہ مرحوم نے بعض احباب اور اعزہ کی تاریخیں واقعی کہی ہیں۔"

حضرت علامہؒ کی کہی ہوئی تاریخوں میں سے جواب تک طبع ہو چکی ہیں، مندرجہ ذیل کا ذکر کتب سیر میں ملتا ہے:

1 1898ء میں سر سید احمد خاں کی وفات پر اقبالؒ نے جو ابھی گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے، قرآن مجید کی آیت "انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک" سے ان کی تاریخ وفات برآمد کی جس سے 1315ھ (1898ء) کے اعدار نکلتے ہیں یہ تاریخ سر سید کی لوح مزار پر آج بھی موجود ہے

2 1900ء (1318ء) میں امیر مینائی کی وفات پر حضرت علامہ نے قرآن کریم کی آیت "لسان صدق فی الاخرین" سے ہجری سنہ میں تاریخ نکالی

1318ھ

---

3 محمد الدین فوق کی تصنیف "شالامار باغ" کے طبع ہونے پر علامہؒ نے اپنے قطعے میں می سزد "تصویر باغ جاں فزا" سے عیسوی

سنہ میں تاریخ نکالی

1901ء

4 اقبال نے اپنے استاد نواب مرزا داغ کی وفات پر کئی تاریخیں کہیں زیادہ مشہور یہ ہوئی

''نواب میرزا داغ''

1322ھ

5 2 جولائی 1918ء (1336ھ) کو علامہ کے قریبی دوست جسٹس شاہ دین ہمایوں کا انتقال ہوا تو علامہ نے تاریخ وفات کے لیے یہ قطعہ موزوں کیا

دو گلستان دہر ہمایون نکتہ سنج
آمد مثال شبنم و چوں بوئے گل رسید
می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت
''علامہ فصیح'' زہر چار سو شنید

''علامہ فصیح کے اعداد 334 ہیں، انہیں 4 سے ضرب دیں تو 1336ھ مطلوبہ تاریخ برآمد ہو جائے گی''

6 علامہ کے محب خاص نواب ذوالفقار علی خان نے 1921ء میں لدھیانے میں ایک گنج تعمیر کیا تھا علامہؒ نے تاریخ کہی

''برز میں خلد بریں آراستند''

1921ء

7 علامہؒ کے دوست میاں غلام رسول صاحب نے مسجد داتا گنج بخشؒ کی تعمیر کی اس پر علامہ نے مندرجہ ذیل شعر سے تاریخ برآمد کی۔

چشم بہ ''المسجد الاقصیٰ'' فگن۔۔۔''الذی بارکہ'' ہم بگو

1340ھ

8 1926ء میں پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر براؤن کی تاریخ وفات قرآن مجید کی آیت ''ذالک الفوز العظیم'' سے برآمد کی جس سے 1926ء کے اعداد نکلتے ہیں۔

9 1926ء (1343ھ) ہی میں اپنی ایک اہلیہ کے انتقال پر ''شہادت رسید و منزل کرو'' (1343ھ) سے تاریخ نکالی

10 1933ء (1351ھ) میں منشی محبوب عالم مالک و مدیر پیسہ اخبار لاہور کی وفات پر مندرجہ ذیل مصرع تاریخ کہا

''معلی تربت محبوب عالم''

1351ھ

11 اپنی دوسری اہلیہ کے وصال پر ''سرمہ مازاغ'' سے تاریخ وفات 1354ھ نکالی

12 علامہ نے اپنے والد بزرگوار شیخ نور محمد کی تاریخ وفات ''

اثر رحمت'' اور'' آغوش لحد'' سے 1349ھ نکالی

13 اور اپنے استاد محترم مولوی سید میر حسن کی تاریخ وفات قرآن کریم کی آیت ''وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین'' سے 1348ھ نکالی۔

علامہ کیا باقاعدہ تاریخ گو شاعر تھے، یہ مسئلہ اکثر ناقدین اقبال کے مابین موضوع بحث رہا ہے، تاہم یہ بات طے ہے کہ ان کی کہی ہوئی معلوم اور مطبوعہ تاریخیں معدودے چند ہیں۔

بہر حال یہ تو ثابت ہو گیا کہ علامہ موصوف نے تاریخ ہائے وفات کہی ہیں، کسی کا سہرا کہنے کا ذکر البتہ کہیں نہیں ملتا جیسا کہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی لکھا ہے:

''علامہ نے تاریخیں کہی ہیں نہ صرف وفات کی تاریخیں کہی ہیں بلکہ بعض موقعوں پر آپ نے شادیوں پر بھی تاریخیں نکالی ہیں''

حقیقت یہ ہے کہ شادیوں پر حضرت علامہ کی کہی ہوئی تاریخوں کے بارے میں آج تک تفصیل سے نہیں لکھا گیا۔

حضرت علامہ کسی کی فرمائش پر شعر کہنے کو آمادہ نہ ہوتے تھے جیسا کہ شہزادہ معظم جاہ ولی عہد ریاست حیدر آباد دکن کی فرمائش پر حضرت علامہ نے شعر کہنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور نواب صاحب رام پور سے بھی اسی بنا پر ملاقات کرنے سے اجتناب فرمایا کہ وہ کہیں ان سے شعر سنانے کی فرمائش نہ کر دیں،

حالانکہ یہ ملاقات کرانے والوں میں حکیم اجمل خان صاحب بھی شامل تھے اس بارے میں محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں

''ایک دفعہ آپ (علامہ) نے فرمایا کہ ''میں بحری جہاز کے ذریعے یورپ سے وطن واپس آ رہا تھا کہ حیدر آباد کے ایک شہزادے معظم جاہ سے جہاز پر ملاقات ہو گئی شہزادے نے فوراً اشعار سنانے کی فرمائش کی مگر میں نے معذرت کر دی۔''

نواب صاحب رام پور سے ملاقات نہ کرنے کے بارے میں عبداللہ چغتائی کی روایت یوں ہے:

''ایک دفعہ میں علامہ کے ہمراہ ڈیرہ دون گیا چودھری محمد حسین اور ملتان کے ایک صاحب بھی شریک سفر تھے آپ کو حکیم اجمل خان سے بی ملاقات کرنی تھی، چنانچہ آپ نے لاہور سے چلنے سے پیشتر رسمی طور پر ان کو ایک تار بھی دے دیا تھا یہ تار ان کو اس وقت ملا جب وہ نواب صاحب رام پور کے ہاں گئے ہوئے تھے ہم صبح صبح حکیم صاحب کے ہاں پہنچ گئے اور ان سے ملاقات کی اسی دوران میں حکیم صاحب نے کہا کہ چونکہ آپ کا تار مجھے نواب صاحب کی موجودگی میں ملا تھا، لہذا وہ بھی آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب حکیم صاحب نے علامہ سے (یہ ملاقات کرنے کے بارے میں) ان کی رائے دریافت کی تو علامہ نے جواب دیا کہ میں صرف اس شرط پر ان سے ملاقات کروں گا

کہ وہ نہ تو مجھ سے اشعار سننے کی فرمائش کریں اور نہ ہی اپنے اشعار مجھے سنائیں یہ جواب سن کر حکیم صاحب خاموش ہو گئے اور پھر اس موضوع پر بات نہیں کی۔''

گو کسی والی ریاست یا اعلیٰ منصب پر فائز کسی شخص کی فرمائش پر شعر کہنا علامہ کو سخت ناگوار تھا، لیکن یاران خاص کا معاملہ دوسرا تھا ایسے ہی ان کے ایک قلبی دوست میاں شاہ نواز بارایٹ لا تھے۔ میاں صاحب کی شادی گیتی آرا دختر سر محمد شفیع سے 1911ء میں ہوئی اس موقع پر علامہ نے فارسی میں ایک سہرا پڑھا یہ سہرا نہ تو علامہ کے مطبوعہ کلام کے کسی مجموعے میں شامل ہے نہ ہی اس کا ذکر علامہ کے تذکرہ نگاروں یا سوانح حیات لکھنے والوں نے کہیں کیا ہے یہ سہرا کئی لحاظ سے خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سے حضرت علامہ کی معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

میاں محمد شفیع نے ، باغبان پورہ کے نواح میں، باغ مہابت خان میں 14اپریل 1911ءکو اپنی دختر کی میاں شاہ نواز سے شادی کی تقریب سعید کے موقع پر لاہور کے تمام ہندو، مسلم معززین اور دور و نزدیک کے احباب کو پرتکلف دعوت دی تھی یہ دعوت سن 1911ء کی ایک یادگار تقریب تھی میاں محمد شفیع سے حضرت علامہ خاص تعلق خاطر رکھتے تھےاس بارے میں جناب سید نذیر نیازی رقم طراز ہیں:

''سر شفیع سے بھی جو میاں شاہ دین کے برادر عم زاد تھے، میاں

صاحب ہی کی صحبتوں میں دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ سر شفیع کو بھی شعروسخن کا شوق تھا، کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے محمد اقبال ان کی شرافت، نیک دلی اورقومی ہمدردی کا اکثر ذکر کرتے۔ ادھر میاں صاحب کے خلوص کا یہ عالم کہ وائسرائے کی کونسل کے رکن بنےتو انارکلی میں اپنا دفتر ہی نہیں، جہاں 1922ء تک محمد اقبال کا قیام رہا، اپنے مقدمات اور منشی شیخ طاہر الدین کو بھی ان کے حوالے کر گئے انہوں نے انجمن حمایت اسلام، لاہور کی شہری زندگی، ملی اور سیاسی تحریکوں میں محمد اقبال کا ساتھ دیا۔ وہ ان کے خلوص اور غریب پروری کی تعریف کرتے میاں صاحب کے اچانک انتقال کی خبر سنی تو دلی صدمہ ہوا۔ 9 جنوری 1933ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کا نمائندہ ان سے ملاتو میاں صاحب کی تعزیت کرتے ہوئے کہا:''

''خدا نے انہیں اعلیٰ قسم کی گھریلو اور معاشرتی خوبیوں سے نوازا تھا وہ ایک محبت کرنے والے باپ اور خاوند، ایک ممتاز قانون دان اور تیز فہم سیاست دان تھے بار اور سیاسی کانفرنسوں میں یکساں طور پر نمایاں رہتے میاں صاحب دل سے مسلمانوں کے ہمدرد تھے سیاست میں ان کا مسلک بڑا نرم تھا انہیں سرکار سے وفاداری کے طعنے دیے جاتے۔''

محمد اقبال کہتے:

''بے شک وفاداری ان کا مسلک تھا، لیکن ان معنوں میں نہیں

جن معنوں میں لوگ سمجھتے ہیں افسوس ہے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی
کمی ہے مسلمان صحیح معنوں میں با اعتبار ''یمین و یسار'' دو سیاسی
جماعتیں قائم نہیں کر سکے میاں صاحب ایک اعتدال پسند سیاست
دان تھے اور ملک وقوم کے بہی خواہ ان کی سیاسی روش وہی تھی جو
ہندوؤں میں (لبرل) اعتدال پسند سیاست دانوں کی تھی''

میاں شاہ نواز کو یہ اعزاز حاصل ہے، اور غالباً اس میں وہ منفرد ہیں کہ حضرت
علامہ نے ان کی شادی پر سہرا لکھا میاں شاہ نواز سے علامہ کے ذاتی مراسم بھی
خاصے گہرے تھے سید نذیر نیازی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''میاں شاہ نواز سے کہ سر شفیع کے داماد اور میاں شاہ دین کے
برادرزادے تھے، محمد اقبال کی دوستی کی داستان بڑی طویل ہے ان سے بھی
اسی زمانے میں ملاقات ہوئی جب میاں خاندان سے ان کے تعلقات
بڑھ رہے تھے انگلستان سے واپس آئے تو بار روم کی محفلوں، آئے دن
کی ملاقاتوں، جلسوں اور محفلوں میں ایسا یارانہ گٹھا کہ ایک جان دو
قالب کی سی صورت پیدا ہو گئی شاہ نواز اور محمد اقبال ایک دوسرے کے
ہمدم، ندیم وجلیس تھے۔ دوستی ایسی کہ دوران علالت میں بھی ایک
دوسرے سے ملنے میں فرق نہ آیا اور ایک دوسرے کی مزاج پرسی سے
غافل نہ رہتے محمد اقبال علیل ہیں، اتنے علیل کہ بستر سے ہلنا مشکل
ہے، شاہ نواز کو فالج نے بے حس وحرکت کر رکھا ہے لیکن دوستی اور محبت

کا یہ عالم کہ ملازم انہیں گاڑی میں بٹھاتا، جاوید منزل لے جاتا گاڑی
محمد اقبال کے پلنگ کے ساتھ لگادی جاتی محمد اقبال بستر میں لیٹے لیٹے
آگے بڑھتے۔ گھنٹوں باتیں کرتے اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد نہ معلوم
انہیں کہاں کہاں لے جاتی محمد اقبال کہتے اب تو ہمارا آپ کا ملنا ''
چکوے چکوی'' کا ملنا ہے شاہ نواز سخن فہم تھے ''بلی چوہے کو دیتی ہے،
پیغام اتحاد'' والے قطعے میں جو محمد اقبال نے 1915ء میں انجمن حمایت
اسلام کے جلسے میں پڑھا، شاہ نواز ہی ان کا فقرہ جو انہوں نے لندن
کے لاٹ پادری پر چست کیا تھا، نظم ہوگیا ہے (پادری صاحب بلی کی
طرح مسلمانوں کو دعوت اتحاد دے رہے ہیں کہ آیئے مل کر تر کان بد
نہاد کا قلع قمع کر دیں۔)''

شاہ نواز سیاسی داؤ پیچ بھی خوب سمجھتے تھے محمد اقبال کی ان اصابت
رائے کے قائل تھے ان کے ایثار اور اخلاق کی تعریف کرتے، بہ افسوس
فرماتے شاہ نواز بہت بڑا آدمی ہے، بہت بڑا آدمی ہوتا لیکن حالات
راستے میں حائل ہوگئے اور وہ آگے نہ بڑھ سکے میں نے ان کی دو تین
ملاقاتوں کا حال دیکھا ہے، ان کے خلوص اور محبت کی کیفیت بیان میں
نہیں آسکتی۔

یہی ''چکوے چکوی'' کا تعلق تھا جس نے اقبال سے یہ پہلا سہرا کہلوایا یہ سہرا
اور رو داد تقریب شادی روزنامہ پیسہ اخبار، لاہور کی اشاعت

مورخہ 18 اپریل 1911ء میں اس طرح شائع ہوئی:

شادی

12 اپریل کو میاں محمد شاہ نواز صاحب بیرسٹر ایٹ لاء کی شادی آنر ایبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لاء کی دختر نیک اختر سے بمقام باغبان پورہ ہوئی 14 کو میاں محمد شفیع نے لاہور کے تمام ہندو، مسلمان معززین اور اپنے بیرون جات کے احباب کو ایک پر تکلف دعوت باغ مہابت خان میں دی جو باغبان پورہ کے محاذی میں واقع ہے کھانے کے اختتام پر جبکہ بہت سے مہمان شامیانے کے نیچے آرام کرتے تھے تو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لاء نے میاں محمد شاہ نواز بیرسٹر ایٹ لاء کی شادی کی تاریخ فارسی میں حسب ذیل موزوں فرمائی تاریخ چونکہ "بلا تعمیہ و تخرجہ" ہے اس لیے نہایت پسند کی گئی دعا ہے کہ خدا اس شادی کو مبارک کرے تاریخ حسب ذیل ہے۔

رونق بزم احباء شہ نواز

کاخ جاہ او فلک بنیاد باد

زینت گیتی بماند تا ابد

شمع عمرش از ہوا آزاد باد

دشمناں را خار پہلو عیش او

برلب ما مشاد باد آباد باد

قمری دولت تہ دام آورد

بلبل اقبال را صیاد باد

بہر سال عقد او آمد ندا

''خانہ فرخندہ اش آباد باد''

1911ء

سہرے کا ترجمہ بھی اردو خواں قارئین کی سہولت کے لئے پیش خدمت ہے:

1 شاہ نواز احباب کی بزم کی رونق ہے اور اس کے جاہ و جلال کے محل کی بنیاد فلک پر ہے۔

2 اس کی دنیا کی زینت ابد تک رہے گی اس کی عمر کی شمع دنیا کی ہواؤں سے محفوظ ہے۔

3 اس کا عیش دشمنوں کے ولولوں کے لیے بمنزلہ خار کے ہے لیکن ہمارے لبوں پر وہ ہمیشہ شاد و آباد رہے کی دعا رہے گی۔

4 دولت کا پرندہ اس نے جال میں پھانس لیا ہے اور وہ اقبال مندی کے بلبل کا ہمیشہ سے شکاری رہا ہے

5 اس کی شادی کے سال کے لیے (غیب سے) یہ ندا آئی کہ اس کا خوش وخرم گھر ہمیشہ آباد رہے

اب سہرے کی معنوی خوبیوں کے بارے میں چند باتیں:

پہلے شعر میں اقبال نے دو مطالب بیک وقت بیان کیے ہیں یعنی شاہ نواز دوستوں کی محفل کی جان ہے اور اس وقت بھی دولہا شاہ نواز دوستوں کی محفل کی رونق کا باعث ہے، اور دولہا میاں کی ذاتی اور خاندانی وجاہت کا شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے اظہار کیا گیا ہے۔

دوسرا شعر خاص طور پر اقبال کی شاعرانہ مہارت کا ثبوت ہے دلہن کا نام گیتی آرام تھا گیتی (زندگی) گویا شاہ نواز کی زندگی بن گئی تھی

دیکھیے شاعر نے دلہن کے نام کی مناسبت سے مصرع کو ذومعنی بنا کر کس قدر خوبصورت اور لطیف مطالب اخذ کیے ہیں ساتھ ہی یہ دعا کی گئی ہے کہ دولہا، دلہن کی زندگی دنیا کے خطرات سے محفوظ رہے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے شمع اور ہوا کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرے شعر میں فرماتے ہیں دشمن تو دولہا کے عیش میں خار بن کر حائل ہیں لیکن شاعر کے لبوں پر یہی دعا ہے کہ دولہا ہمیشہ شادکام رہے۔

چوتھے شعر میں نہایت ہی خوبصورت اور نفیس شاعرانہ استعاروں میں دولہا کی دولت مندی اور عروج کی دعا کی گئی ہے کہ دولت کا پرندہ ہمیشہ دولہا کے جال کا اسیر رہے اور عزت ووقار کی بلبل ہمیشہ ان کے قابو میں رہے۔

پانچویں اور آخری شعر میں طویل اور خوش وخرم ازدواجی زندگی کی دعا کی گئی ہے۔

آخری مصرع کی خصوصیت یہ ہے کہ شادی کے سال کی تاریخ یعنی سن 1911ء اسی سے نکالی گئی ہے۔

بعض نقاد سہرا لکھنا شاعر، اور خصوصاً اقبال جیسے بلند اقبال شاعر کے شایان شان نہیں سمجھتے حالانکہ تاریخ گوئی اور سہرا لکھنا تسلیم شدہ اصناف شاعری ہیں اور انہیں کسی طرح بھی دوسری اصناف سخن سے کم تر نہ گردانا چاہیے۔ ذوق، مومن اور غالب نے تاریخ گوئی اور سہرا نگاری پر فخر کیا پھر یہ بزرگ شعراء اور خود اقبال کوئی پیشہ ور تاریخ گو، اور سہرا نگار نہ تھے انہوں نے ہمیشہ اپنے اعزہ کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں نکالیں اور عزیز ترین احباب یا محسنوں کے سہرے لکھے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، عبداللہ چغتائی کے مطابق اقبال نے سہرے لکھے ہیں لیکن تا حال شاہ نواز اور گیتی آرا کی شادی کے موقع پر کہے ہوئے سہرے کے سوا کوئی اور سہرا منظر عام پر نہیں آیا یہ سہرا بھی اتفاقاً میری نظر سے گزرا جسے میں نے اقبال کی باقیات میں ایک نادر اضافہ سمجھتے ہوئے اقبال کے مداحوں کی ضیافت طبع کے لیے اقبال اکادمی پاکستان کے مجلّہ ''اقبالیات'' میں اشاعت کے لیے پیش کر دیا ہے۔

حوالے

1 ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں (مجلس ترقی ادب لاہور 1988ء) صفحہ 217-218

2 عبدالحفیظ ہوشیار پوری، تاریخ گو اقبال، روزنامہ آفاق لاہور 21

اپریل 1952ء

3 عبداللہ چغتائی، ''اقبال کی صحبت میں''صفحات 328-322

4 سید نذیر نیازی، دانائے راز، سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبال ''اقبال اکادمی پاکستان (1989) صفحہ 194-193''

5 سید نذیر نیازی، دانائے راز، سوانح حیات حکیم الامت حضرت علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان (1979ء) صفحہ 195-192
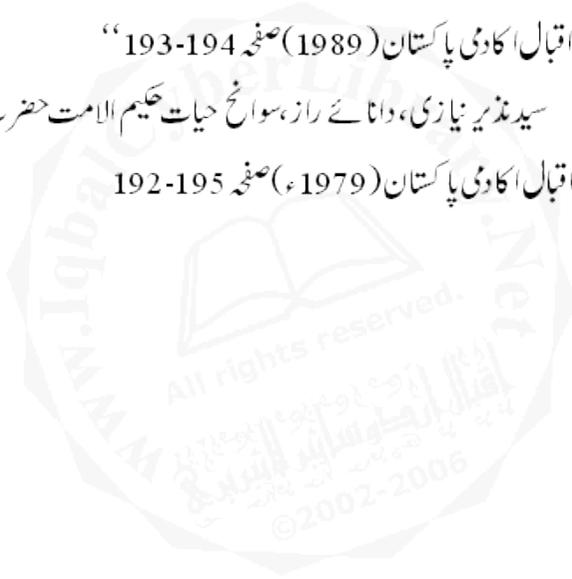
اقبالؒ کی شاعری میں آئینے کا مفہوم

پروفیسر محمد انور صادق

اقبال شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، اس لیے جب وہ شاعری کرتے ہیں تو انہیں شاعرانہ وسیلوں سے کام چلانا پڑتا ہے، اور جب وہ فلسفیانہ مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں تو انہیں فلسفے کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، تخیل سے شاعرانہ مواد حاصل ہوتا ہے جسے تشبیہات و استعارات اور رموز و علامات سے مزین کر کے بیان کیا جاتا ہے، جبکہ فلسفے کا مواد تعقل سے حاصل ہوتا ہے جو صاف ستھری اور غیر مبہم زبان کا تقاضا کرتا ہے، اس لیے جب ایک فرد شاعر بھی ہو اور فلسفی بھی تو اسے بیک وقت شاعری اور فلسفے کے تقاضوں پر پورا اترنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ دونوں میں تضادات کی شکل میں نمودار ہو سکتا ہے اقبال کی شاعری اور فلسفہ بھی اس صورت حال سے دو چار ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، لیکن بعض اوقات ان کی شاعرانہ اور فلسفیانہ فکر میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے اقبال کی اس فکری ہم آہنگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں

"ایک شاعر جب نثر نگار بھی ہو تو اس کے اشعار اور عبارتیں متقابل وضاحت پیش کرتی ہیں علامہ اقبال کے ہاں بھی ایسے ہی ہے،

یعنی کبھی نثر شعر کی اور شعر نثر کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔‘‘

اقبال کی شاعری میں آئینے کی علامت ان کی شاعرانہ اور فلسفیانہ فکر کی مطابقت اور ہم آہنگی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے جس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور اقبال کی فکری ہم آہنگیوں کی تلاش میں مددگار بھی مثال کے طور پر اقبال اپنے تصور زمان و مکاں اور فلسفہ تاریخ جیسے فلسفیانہ تصورات کو ’’آئینہ ایام‘‘ اور ’’دہر کے آئینہ خانے‘‘ جیسی شاعرانہ ترکیبوں کی مدد سے بیان کرتے ہیں تو وہ گویا اپنی شاعری میں آئینے کو ان تصورات کے علامتی مظہر کے طور پر استعمال کر رہے ہوتے ہیں روح ارضی کی جانب سے آدم کا استقبال کرتے ہوئے اسے آئینہ ’’آئینہ ایام‘‘ میں اپنی ادا دیکھ کر تعمیر خودی کی دعوت ایک طرف سے زمان و مکان اور تاریخ کی قوتوں سے نبرد آزمائی کا چیلنج ہی تو ہے اب اگر اقبال اپنے فلسفہ تاریخ کے لیے بحیثیت مجموعی ’’آئینہ ایام‘‘ کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو اسی مناسبت سے وہ تاریخ کے اجزا کے لیے بھی آئینے، ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر اقبال کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں

سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اب اگر اقبال کے مندرجہ بالا اشعار پر غور کیا جائے تو ان کا فلسفہ تاریخ کھل کر سامنے آ جاتا ہے ان کے نزدیک سنگ امروز کو آئینہ بنائے بغیر نہ ماضی کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور نہ مستقبل کے امکانات کو گرفت میں لیا جا سکتا ہے اقبال کے مطابق سنگ امروز کو آئینہ بنانے کا آسان نسخہ عشق ہے لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اقبال عشق سے کیا مراد لیتے ہیں اس کا جواب بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم یہ ہے۔

''عشق قوت عمل اور جوش انقلاب کا ایک بے پناہ سیلاب ہے اس کا وظیفہ زمانے کے ساتھ موافقت اور مطابقت پیدا کرنا نہیں بلکہ نا موافق و نا مساعد زمانے کو اپنی آرزو کے مطابق ڈھالنا ہے۔''

انبیاء جو اقبال کے نزدیک دولت عشق سے مالا مال ہوتے ہیں، زمانے کی قوتوں کو گرفت میں لا کر تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنے خطبے ''اسلامی ثقافت کی روح''میں تحریر کرتے ہیں

''نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کی صورت گر ہیں، مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔''

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کے ہاں عشق، جنون اور وجدان تاثراتی اور علمیاتی لحاظ سے مترادف

اصطلاحات ہیں اقبال فرماتے ہیں

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

اقبال کا تصور زمان و مکاں اور فلسفہ تاریخ لازمی طور پر ان کے تصور عشق سے وابستہ ہے وہ انسان جو قوت عشق سے تاریخ اور زمانے کی قوتوں پر غلبہ پا لیتا ہے اقبال اسے مردحر کا نام دیتے ہیں اور وہ انسان جو ان قوتوں پر قابو پانے کے بجائے خود ان کا غلام بن جاتا ہے اقبال اسے عبد کہتے ہیں اقبال مردحر اور بندہ محکوم کی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

""محکوم"" زمانے کی قید و بند میں جکڑا ہوتا ہے اور اس سے باہر نہیں نکل سکتا جبکہ مردحر آزاد ہوتا ہے اور وہ زمانے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے

اقبال کے نزدیک مردحر آئینہ ایام، یعنی تاریخ کا جوہر ہوتا ہے، اس لیے ""بندہ محکوم"" کو اس آئینے کے چہرے پر زنگ ہی قرار دیا جا سکتا ہے جو زندگی کے امکانات کو اجاگر کرنے کے بجائے اور بھی دھندلا دیتا ہے مردحر، اگر آئینہ ایام کا جوہر ہے تو عمل مردحر کے آئینہ ہستی کا جوہر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کے تصور عشق میں عمل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جس کے بغیر تاریخ کا رخ نہیں موڑا جا سکتا اقبال مردحر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں

بے خبر! تو جوہر آئینہ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ایک اور شعر میں مسلمانوں کو ان کا ماضی یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا

اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا

اقبال اپنی شاعری میں جس چیز کو ''آئینہ ایام'' قرار دیتے ہیں وہ ان کے خطبات میں ''ایام اللہ'' بن جاتی ہے اقبال، تاریخ کو علم کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے ''اسلامی ثقافت کی روح'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن پاک نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام وامم کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی، دونوں لحاظ سے کیا جاتا ہے مزید یہ کہ انہیں اپنی بداعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی ملتی ہے، اور یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں اس نے بار بار تاریخ سے استناد کیا۔''

تاریخ اقبال جسے ''سلسلہ روز و شب'' کا نام بھی دیتے ہیں افراد اور اقوام کا مسلسل محاسبہ کرتی رہتی ہے اور وہی افراد و اقوام بقائے دوام کے سزاوار ٹھہرتے ہیں جو اس کے معیار پر پورے اترتے ہیں، لیکن تاریخ کی کسوٹی پر پورا نہ اترنے والی اقوام موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں یہ وہ تاریخی اصول ہے جس سے مفر کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ بزبان اقبال یہ ہے۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اقبال نے ایام سے آئینہ سازی کے علاوہ الفاظ کے آئینے بھی بنائے ہیں جن کی روشنی میں ان کے فلسفہ زبان و بیان کو باسانی سمجھا جا سکتا ہے انسانی ذہن یا شخصیت کو اگر آئینہ قرار دیا جائے تو "ذوق گویائی" اقبال کے نزدیک اس آئینے کا جوہر ہے اب اگر آئینے میں اس کا جوہر باقی نہ رہے تو آئینہ، آئینہ نہیں رہتا۔ انسان کا ذوق گویائی ہی اسے انسان بناتا ہے اقبال اس حقیقت سے بخوبی باخبر ہیں کہ انسان ایک حیوان ناطق ہے، اور نطق ہی انسان کو حیوان سے امتیاز بخشتا ہے نطق میں گویائی بھی شامل ہے اور روانائی بھی، جیسا کہ بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

> "انسان کی ایک عام تعریف جو منطق کی کتابوں میں ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے نطق میں گویائی بھی داخل ہے اور عقل بھی"

الفاظ پر دسترس حاصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے گویائی کے ساتھ ساتھ عقل سے کام لینا بھی سیکھ لیا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال جب اپنی تمام تر شاعرانہ اور حکیمانہ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس جوہر کی آرزو کرتے ہیں جو ذوق گویائی کو خموشی سے بدل دے۔

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان نے اپنی زبان دانی کی بدولت دوسری مخلوقات پر واضح برتری حاصل کر لی ہے اور الفاظ کو اپنے ذہن کا آئینہ بنالیا ہے، لیکن اس کے باوجود اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسانی دل و دماغ میں اٹھنے والے جذبات و خیالات کی تصویر کشی میں الفاظ کے یہ آئینے یا تو مکمل طور پر ناکام ہو جاتے ہیں یا پھر ان کی دھندلی تصویریں پیش کرتے ہیں ابلاغ کے سلسلے میں زبان کی انہی رکاوٹوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر رقمطراز ہیں:

''ابلاغ کے سلسلے میں بعض اوقات رکاوٹ بھی بنتی ہے یہ اس لیے کہ زبان جہاں اظہار میں امداد کرتی ہے وہاں بعض پابندیوں کی بنا پر رکاوٹ بھی بن سکتی ہے جذبات کا تیز دھارا جب زبان کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے تو پاگل کی بڑ، غصے کی گرج اور ہذیان کی چیخ جنم لیتی ہے۔''

کیا اقبال کے یہ اشعار ابلاغ کے سلسلے میں زبان کی خامیوں کی واضح نشان دہی کرتے دکھائی نہیں دیتے؟

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبال جب مابعد الطبیعیاتی سطح پر اظہار حقیقت کے ضمن میں زبان کا کردار دیکھتے ہیں تو اس کی کم مائیگی کا احساس اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے گفتار جو اقبال کی رائے میں روزمرہ زندگی کے حقائق کا دھندلا سا آئینہ ہی سہی، اظہار حقیقت کے باب میں زنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے حقیقت کا آئینہ روشن ہونے کے بجائے غبار آلود ہو جاتا ہے اقبال جو ایک شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، زبان کے اظہاری اور عقلی پہلوؤں پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود اظہار حقیقت کے سلسلے میں جامہ حرف کی تنگ دامانی کا شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اظہار حقیقت کے سلسلے میں زبان (گویائی + تعقل) کی ناکامی کا یہ علاج تجویز کرتے ہیں کہ:

"حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال لقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے فواد یا قلب سے تعبیر کیا قلب کو ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت کہیے جس کی پرورش مولانا رومؒ کے دلکش الفاظ میں نور آفتاب سے ہوتی ہے اسے دراصل حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کا وہ طریق ٹھہرانا چاہیے جس میں باعتبار عضویات، حواس کا مطلق دخل نہیں ہوتا"

حقیقت پہ ہے جامہ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ، گفتار زنگ

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال اپنی نثری تحریروں میں زبان اور اس کے ارتقاء کے

بارے میں کیا تحریر کرتے ہیں اقبال 19 اگست 1923ء کو سردار عبدالرب نشتر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔''

اقبال کے نزدیک زبانوں میں انقلاب کی یہ صلاحیت ان کی اندرونی قوتوں سے نشوونما پاتی ہے اور ان کی بقا کا انحصار نئے نئے خیالات اور جذبات کو ادا کر سکنے کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ اقبال اپنے ایک مضمون ''ہماری قومی زندگی'' میں زبانوں کے قانون ارتقاء پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک زمانہ تھا جب یونانی یا لاطینی اور سنسکرت وغیرہ زندہ زبانیں تھیں، مگر اب ایک عرصے سے یہ زبانیں بے جان ہو چکی ہیں۔ ان کی موت کا راز اس قانون کا عمل ہے، اور خود پنجابی زبان جس کو ہم روز مرہ استعمال کرتے ہیں، اس سے روز بروز متاثر ہو رہی ہے۔ ایسے حالات میں یہ لازم ہے کہ اس زبان کا حشر وہی ہو جو اور قدیم زبانوں کا ہوا ہے۔''

اقبال کا فن آئینہ سازی اس وقت اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے جب وہ ''صیقل عشق'' اور ''جنون فتنہ سامان'' کی مدد سے دلوں کو آئینہ بناتے ہیں اقبال کے

یہ آئینے اگر ایک طرف کائنات کے حقائق علمیہ کا انکشاف کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ حسن ازل کی کشش سے پیدا ہونے والے جذباتی اتار چڑھاؤ کی جاں سوز کیفیات سے بھی آگاہ کرتے ہیں بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

''عشق کے دو پہلو ہیں ایک تاثراتی یا جذباتی، اور دوسرا نظریاتی، یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے جدا بھی ہو سکتے ہیں اور باہم مخلوط بھی ہوتے ہیں''

اس لیے کہ تاثراتی یا جذباتی پہلو کا تعلق واردات قلب سے ہے جبکہ نظریاتی پہلو کا ماہیت اشیاء سے نظریاتی عشق کو اقبال علمیاتی زبان میں وجدان اور شاعرانہ زبان میں دل کا نام دیتے ہیں چنانچہ اقبال اپنی شاعری اور فلسفے میں وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کا آئینہ دل یا وجدان انہیں دکھاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ شاعری میں جو بات وہ شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں، فلسفے میں وہی بات فلسفیانہ اسلوب میں کرتے ہیں جس سے بعض اوقات تضاد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا

اقبال کی یہ پختہ رائے ہے کہ ایک انسان جب عشق و جنون یا یہ کہ وجدان کو اپنا ذریعہ علم بنا لیتا ہے تو نہ صرف اس پر کائنات کے اسرار و رموز منکشف ہونے لگتے ہیں بلکہ وہ اس کی گہری سے گہری آرزوؤں کی تکمیل میں شریک بھی ہونے لگتا ہے ایسے مرد خود آگاہ کا آئینہ دل قضا کے راز دانوں میں شمار ہونے لگتا ہے اقبال اپنے قاری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تجھے میری آتش نوائی یعنی شاعری کا راز

دریافت کرنے کا شوق ہے تو آ میرے سینے میں جھانک کر دیکھ، تجھے میرے آئینہ دل میں تقدیر کے جلوے منعکس ہوتے دکھائی دیں گے جنہیں میں الفاظ کا جامہ دے دیتا ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ تقدیر یا قضا جو شاعر کے آئینہ دل پر منعکس ہوتی ہے، کیا چیز ہے اس کا جواب بالفاظ اقبال یہ ہے۔

> "دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کے امکانات کا انکشاف ابھی باقی ہے یہ گویا وہ زمانہ ہے جو علت و معلول کی ترتیب سے آزاد ہے۔۔۔۔۔کسی شے کی تقدیر قسمت کا وہ بے رحم ہاتھ نہیں جو ایک سخت گیر آقا کی طرح خارج سے کام کر رہا ہو بلکہ یہ ہر شے کی حد وسع ہے، یعنی اس کے وہ امکانات جن کا حصول ممکن ہے"

گویا انسان عشق سے، آنے والے واقعات کا ادراک حاصل کر سکتا ہے

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوہ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

اقبال نے عشق و جنون یا وجدان کے علاوہ عقل اور ادراک کو بھی آئینے ہی قرار دیا ہے، اور یوں ان کے ہاں علمیاتی سطح پر یہ سوال نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے کہ وہ ان تینوں میں سے کس کو علم کا بہترین ذریعہ خیال کرتے ہیں راقم کے خیال

میں اس کا جواب یہ ہے:

''بطور شاعر اور فلاسفر، اقبال کی فکر کا فلسفے کے تین مکاتب فکر یعنی عقلیت، وجدانیت اور تجربیت میں سے کسی ایک نظریے کی روشنی میں ادراک ممکن نہیں ان کے نزدیک علم وجدان، تجربے اور مشاہدے تینوں کا امتزاج ہے اور سب مل کر ایک اکائی کی تعمیر کرتے ہیں حقیقت مطلق تک پہنچنے کے لیے سائنسی اور وجدانی زاویے کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔''

ایک ایسی ہی رائے کا اظہار جمیلہ خاتون نے بھی کیا وہ تحریر کرتی ہیں:

Iqbal cannot be clossed under any of the three schools of Philosophical thought: the empiricist, the rationalist or the intuitionist in his theory of knowledge, sense perception, reason and intuition, all are combined in an organic whole

اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ انہوں نے وجدان کی طرح عقل اور ادراک کو بھی آئینے قرار دیا ہے جن میں کائنات کے اسرار و رموز جلوہ فگن ہوتے رہتے ہیں۔

حادثہ وہ جو ابھی پردہ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینہ عقل دوربیں میں نے

اقبال کا تصور علم اپنے اجزائے ترکیبی میں اعتدال اور توازن کے بغیر نامکمل رہتا ہے اس بات کی وضاحت کے لیے ہمیں خودی کے فعال وکارفرما اور بصیر وقدر آشنا پہلوؤں کی تفہیم حاصل کرنا ہوگی۔ اقبال کے نزدیک خودی کے فعال پہلو کا تعلق دنیائے خارج سے ہوتا ہے اور اسے خودی کی جلوت کا پہلو بھی کہا جاتا ہے (جبکہ خودی کے بصیر پہلو کا تعلق دنیائے داخل سے ہوتا ہے اور اسے خودی کی خلوت کا پہلو کہا جاتا ہے) عقل انسان کو جلوت کی طرف کھینچتی ہے اور عشق خلوت کی جانب اگر انسان جلوت کا ہو رہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا عشق یا یہ کہ اس کا آئینہ دل دھندلا جاتا ہے اور انسان کے افکار وخیالات ابتر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں بقول ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم:

"اقبال کے نزدیک عشق کی بہترین مثال رسول کریمؐ کی زندگی ہے جس میں خلوت وجلوت کا توازن پایا جاتا ہے عقل جلوت کی طرف کھینچتی ہے اور عشق خلوت کی جانب، لیکن زندگی کی تکمیل دونوں کے توازن سے ہوتی ہے۔"

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ، آئینہ دل ہے مکدر

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پرا گندہ و ابتر

اقبال اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ انسان کا دل حسن کا آئینہ ہے اور حسن آئینہ حق ہے اس لیے جو انسان تلاش حق کی آرزو رکھتا ہے اسے اپنے دل میں حسن کی محبت پیدا کرنی چاہیے چنانچہ اقبال اپنے خورشید سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، کاش! میرا سینہ تیرے حسن کے جلووں کا نشیمن بن جائے اور میرے آئینے میں تیرا عکس آباد ہو جائے دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کی یہ آرزو بہت جلد پوری ہو جاتی ہے اور ایک بار پھر اپنے خورشید (حسن) سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں جب سے تیرا عشق میرے سینے میں آباد ہوا ہے، میرے آئینے میں نئے نئے جوہر پیدا ہو گئے ہیں اب اقبال کو معلوم ہوتا ہے کہ عشق و محبت درحقیقت ایک طرح کا غازہ ہے جسے اگر خاک سیاہ پر بھی مل دیا جائے تو وہ آئینہ بن جاتی ہے اور اس میں ہمدم دیرینہ، کا عکس پھر دکھائی دینے لگتا ہے اقبال کے نزدیک عشق و محبت سے خالی دل خاک سیاہ ہی کے مانند ہوتا ہے کیا اقبال کے یہ اشعار ان کے تاثراتی تصور عشق کے آئینہ دار دکھائی نہیں دیتے؟

تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں
عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں

نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

غازہ الفت سے یہ خاک سیہ آئینہ ہے

اور آئینے میں عکس ہمدم دیرینہ ہے

اقبال نے اپنی شاعری میں عشق سے نہ صرف دلوں کے آئینے بنائے ہیں بلکہ انہیں محفوظ رکھنے اور آلودگی سے بچانے، نیز ان کے انعکاسی عمل کو بڑھانے کے طریقے بھی بیان کیے ہیں نظریاتی عشق میں اگر جلوت کی ہوس کا ذوق نظر کی حد سے بڑھ جانا آئینہ دل کو خراب کرتا ہے تو تاثراتی عشق میں شرار آرزو کی چکا چوند اس کی چمک کو ماند کر دیتی ہے اور غبار آرزو اسے دھندلا بنا دیتا ہے، لیکن اس کے برعکس حادثات غم سے پیدا ہونے والی گرد ملال آئینہ دل کو اور بھی چمکیلا بنا دیتی ہے جس سے انسانی شخصیت کی تکمیل میں مدد ملتی ہے اقبال کے نزدیک غم کا داغ سینہ عاشق کا چراغ ہوتا ہے جس سے اٹھنے والی آہوں کا دھواں یا تو آئینہ دل کو جلا دیتا ہے یا پھر خود آئینہ بن جاتا ہے اور انسانی روح کو آرائش جمال کا موقع فراہم کرتا ہے اقبال کے خیال میں آئینہ دل جب حادثات غم سے ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی قدر و قیمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جس سے آئینہ ساز کی نگاہوں میں اپنی تخلیق عزیز تر ہو جاتی ہے اقبال کا فلسفہ غم در حقیقت دل کے آئینوں کی شکست و ریخت کی صدائے بازگشت ہی کا دوسرا نام ہے اقبال فرماتے ہیں۔

حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال

غازہ ہے آئینہ دل کے لیے گرد ملال

دیدہ بینا میں داغ غم چراغ سینہ ہے
روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئنہ ساز میں

اقبال نے اپنی شاعری میں ایام، الفاظ اور قلوب کے علاوہ اشیائے فطرت کے آئینے بھی بنائے ہیں اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال نہ صرف نوفلاطونی تھے بلکہ وحدت الوجود پر بھی کامل یقین رکھتے تھے جس کے تحت انہیں کائنات کی ہر شے میں حسن ازل ہی کے جلوے دکھائی دیتے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس دور میں انہیں کائنات کی ہر چیز پیکر حسن معلوم ہوتی تھے جسے ہر وقت آرائش جمال کی خاطر آئینے کی ضرورت رہتی ہو چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اشیائے فطرت کے لیے اشیائے فطرت ہی کے آئینے بنائے ہیں جن میں حسن فطرت کے علاوہ حسن خاطر کے جلوے بھی دکھائی دیتے ہیں مثال کے طور پر وہ خرام دریا کو صبح کی شفق کا آئینہ بناتے ہیں اور شام کی خاموشی کو نغمہ شام کا آئینہ قرار دیتے ہیں اسی طرح وہ پھول کی پتی کا آئینہ بنا کر بہار کے سامنے رکھ دیتے ہیں تا کہ وہ اس میں اپنے خوب صورت

رخساروں کا مشاہدہ کر سکے یا پھر بادبہار کو غنچہ گل کے لیے آئینہ بنا دیتے ہیں اقبال کے نزدیک جبین ماہ بھی حسن فطرت کا آئینہ ہے اس طرح اقبال کی شاعری میں کائنات ایک ''آئینہ خانہ'' کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے جس کا آغاز بھی حیرت ہے اورانجام بھی حیرت۔

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

پانی سے آئینہ سازی اقبال کا خصوصی فن ہے جس کا مظاہرہ ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے کہیں پہاڑ کے دامن میں بہنے والا چشمہ اس کا آئینہ بن جاتا ہے اور کہیں پھول پانی کو آئینہ بنا کر آرائش جمال میں مصروف دکھائی دیتا ہے ایک طرف پہاڑی ندی مشاہد قدرت کو آئینہ دکھلا رہی ہے تو دوسری طرف دریا صبح کی شفق کا آئینہ بن جاتا ہے ادھر شبنم کی آرسی اور نہروں کے آئینے میں کوئی جلوہ گر دکھائی دے رہا ہے تو ادھر صنوبر، ندی کے کنارے محو زیب و زینت نظر آ رہا ہے الغرض اقبال کی شاعری میں پانی سے آئینہ سازی کا فن اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے پانی سے اقبال کی خصوصی رغبت کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''اقبال کا مطالعہ فطرت'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کی ذہنی دنیا میں ایک اور چیز کو بڑی اہمیت حاصل ہے، وہ پانی ہے اس میں بھی ٹھہرے ہوئے پانی کے بجائے آب رواں ان کے لیے زیادہ باعث مسرت ثابت ہوتا ہے۔ اقبال کے ذہن کو متحرک

اور رواں دواں اشیاء سے جو لگاؤ ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ پانی کے
تعلق میں بھی وہ انہی چیزوں سے زیادہ محبت رکھتے ہیں جن میں زیادہ
سے زیادہ حرکت پائی جاتی ہے"

علاوہ ازیں پانی سے آئینہ سازی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں پانی کی چمک آئینے کی چمک سے مشابہ معلوم ہوتی ہے بہر حال سچی بات تو یہ ہے کہ جس قدر آئینے انہوں نے پانی سے بنائے ہیں شاید ہی کسی اور شے سے بنائے ہوں جس کا ایک ثبوت اقبال کے یہ اشعار ہیں۔

چشمہ دامن ترا آئینہ سیال ہے
دامن موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

پانی کو چھو رہی ہے جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

محو زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے
غنچہ گل کے لیے باد بہار آئینہ ہے

آ، میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا
نہروں کے آئنے میں، شبنم کی آرسی میں

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کی آئینہ سازی کا بنیادی محرک کون سا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی تحریکی قوت جوان سے طرح طرح کے آئینے تخلیق کرواتی ہے، اس کا نام عشق ہے لیکن اقبال عشق سے کیا مراد لیتے ہیں، اس کا جواب خود ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

''یہ لفظ (عشق) نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے عشق کسی شے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور اپنا جزو حیات بنا کر اپنا لینے کا نام ہے۔''

اقبال کے ہاں عشق درحقیقت جوش ارتقا، ذوق تخلیق، جذبہ تسخیر اور استحکام ذات ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں وہ اپنے قاری سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، تجھے میری شاعری میں آئینہ سازی کے جو کمال نظر آتے ہیں، وہ سب کے سب عشق کے مرہون منت ہیں اور زیر آسمان آئینہ سازی کا یہ کمال صرف سکندر ہی سے وابستہ نہیں ہے، خود تیرے سینے میں بھی آئینہ سازی کا سارا سامان موجود ہے تو بھی آئینہ ساز بن سکتا ہے لیکن اس کے لیے تجھے اپنے آئینہ دل میں جھانکنا ہو گا، یعنی جذب عشق سے اپنی خودی کا سراغ لگانا ہو گا۔

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر

مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

☆☆☆☆☆☆

حوالے

1اقبالیات 88ء،ص 352 2بال جبریل ص 178

3بانگ درا،ص 72 4ایضاً 132

5بانگ دراص 192 6مقالات حکیم،ص 79

7تشکیل جدید الہیات اسلامیہ 8بانگ درا،ص 207

،ص188

9بانگ درا،ص192 10ایضاً،ص 203

11 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، 12بال جبریل،ص 101

ص 212

13مقالات حکیم،ص 71 14بانگ درا،ص 43

15اقبال کا نفسیاتی مطالعہ،ص 135 16بانگ دراص 150

17ایضاً،ص 266 18تشکیل جدید الہیات اسلامیہ،ص 23

19بال جبریل صفحہ 120 20اقبالنامہ حصہ دوم صفحہ 85

21مقالات اقبال ص 78 22

23بانگ دراص 80 24 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص

72-77

25 بانگ درا،ص 70

26 ایضاً صفحہ 194

27 اقبال، فکر اسلامی کی تشکیل جدید ص 282

28 منتخبات اقبال ریویو (انگریزی) ص 43

29 بال جبریل،ص 24

30 بانگ درا،ص 82

31 فکر اقبال ص 324

32 ضرب کلیم 93,94

33 بانگ درا ص 251

34 بانگ درا،ص 118

35 ایضاً،ص 112

36 ایضاً ص 120

37 بانگ درا،ص 155

38 ایضاً

39 ایضاً،ص 281

40 بانگ درا،ص 251

41 ایضاً،ص 152

42 ص 149

43 ص 126

44 مسائل اقبال،ص 204

45 بانگ درا،ص 22

46 ایضاً ص 47

47 بانگ درا،ص 152

48 ایضاً ص 171

49 مقالات حکیم ص 74,73

50 بانگ درا،ص 130

51 ایضاً ص 72

تبصرہ کتب

اقبالیات کے چند خوشے   از ڈاکٹر انعام الحق کوثر،

مبصر ڈاکٹر وحید عشرت

غالب آگہی   از سید قدرت نقوی،

مبصر محمد رانجھا

آتش زیر پا   از آغا شیدا کاشمیری،

مبصر محمد نذیر رانجھا
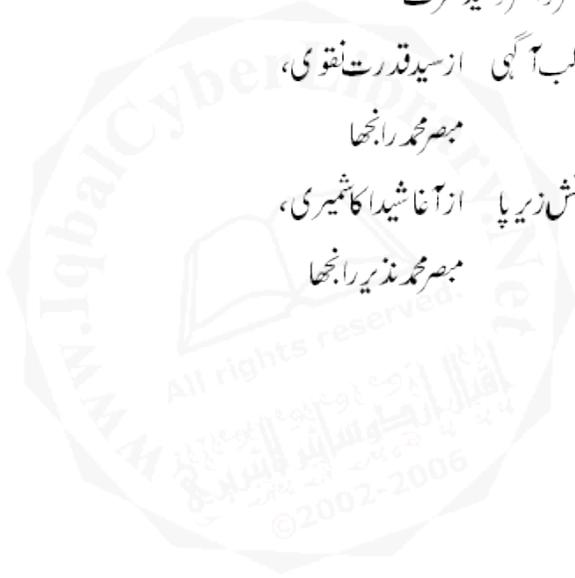
نام کتاب: اقبال کے چند خوشے

نام مصنف: ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ناشر: قریشی پبلیکیشنز چوک مشن روڈ کوئٹہ

قیمت: 45 روپے مجلد سفید کاغذ

مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت

ڈاکٹر انعام الحق کوثر بلوچستان ہی کے نہیں پاکستان کے بھی علمی ادبی افق پر معروف ادیب، ماہر تعلیم، اقبال شناس اور محبت کرنے والے انسان ہیں ''اقبال اور بلوچستان'' بھی ان کی کتاب بڑی معروف تھی جس سے ہمیں پتہ چلتا تھا کہ حضرت علامہ کو بلوچستان سے کس قدر دلچسپی تھی بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' اقبال کی نظم'' ''حریت'' کا وہ استعارہ ہے جو صدیوں تک انسانوں کو راہ منزل دکھاتا رہے گا اقبال نے بلوچستان کا اپنے بھائی کے مقدمے کے سلسلے میں سفر بھی کیا، اور بلوچستان میں اقبالیات کے فروغ کے لئے کی جانے والی کاوشوں سے بھی اس کتاب سے آگاہی ہوتی ہے۔

''اقبالیات کے چند خوشے'' اقبال پر ڈاکٹر کوثر کی کتاب، ان کے مقالات کا مجموعہ ہے اس کتاب میں اقبال اور تحریک پاکستان، نسل نو اور اقبال کا شاہین، اقبال اور قومیت، علامہ اقبال اور عصبیت، تعلیم اقبال کی نظر میں، تعلیم ایک تاریخی عمل کی حیثیت سے، اقبال مرد خود آگاہ، علامہ اقبال کا نظریہ اجتہاد، اقبال کا ذہنی

ارتقا بانگ درا کی روشنی میں، مرد حر اور مرد مومن مقالات ہیں، ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''موجودہ کتاب ''اقبالیات کے چند خوشے'' میرے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے مقصد یہ ہے کہ اقبالیات کے مختلف گوشوں کو عام فہم اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے۔''

اقبال کا اصلاح ملت کا مدعا اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ان کے نور بصیرت سے ہر دھڑکتا ہوا دل روشنی اور حرارت پا سکے اگر میرے ان مقالات اور مضامین سے اقبال کی اس تمنا کی ذرا سی بھی تکمیل کے اسباب ہوتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت بارآور ہوئی

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی محنت یقیناً بارآور ہوئی ہے انہوں نے نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں مضامین اقبال کا ابلاغ دیا ہے خصوصاً نوجوان نسل اور بلوچستان کے عوام میں اقبالیات کا شعور اجاگر کیا ہے ڈاکٹر کوثر کا میرے نزدیک سب سے اہم اور منفرد مقالہ اقبال اور عصبیت ہے لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش بیس ہزار شعر کہے ہیں اشعار کی زیادہ تعداد ایسی ہے جن سے حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور انسان ہر قسم کی عصبیت سے بچ کر عمل کی طرف رجوع کرتا ہے ان کا محبوب پرندہ شاہین بھی سخت کوشی، بلند پروازی اور رفعت پسندی کا عملی ثبوت بہم پہنچاتا ہے ان کے نزدیک ''لالہ'' زندگی کی حرارت کا زمینی

اظہار ہے اور "شفق" اس کا آسمانی مظہر"

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا اسلوب نہایت سادہ، زبان ہر طرح کے تکلف اور ہر طرح کے الجھاؤ سے پاک اور مضامین بھی صاف اور واضح ہیں تمام لوگوں اور طلبہ کے لیے یہ کتاب یوں بھی رہنما ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت اہم اور مشکل موضوعات کو بالکل عام فہم اور سادہ انداز سے بیان کیا ہے یہ کتاب دراصل ایک کلید ہے اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے جو ابھی مبتدی ہیں کتاب کا نام بھی بڑا منفرد ہے "اقبالیات کے چند خوشے" یوں کتاب کے عنوان ہی سے کوئٹہ چمن اور بلوچستان کے دوسرے شہروں میں مہک بار انگور کی بیلوں اور ان کے خوش ذائقہ خوشوں کی خوشبو آنے لگتی ہے خوشے کے عنوان ہی سے مصنف کی بلوچستانیت ٹپکی پڑتی ہے اور یوں اپنے علاقے سے فکر اقبال کو مانوس کرنے کے لیے یہ عنوان بڑا منفرد ہے۔

☆☆☆☆☆☆

نام کتاب: غالب آگہی

مرتب: سید قدرت نقوی

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی برائے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور

صفحات: 368

مبصر: محمد نذیر رانجھا

قیمت: 125 روپے

خدا جانے یہ حقیقت ہے یا غلط العوام میں سے۔۔۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ ''غالب'' کو لکھے جانے والے خط پر صرف ''غالب۔۔۔۔۔ دہلی'' لکھا جاتا تو ''غالب'' اسے وصول کر لیتے، اور اگر غالب کے نام کے ساتھ ان کے پتے کی تفصیل درج ہوتی تو وہ ڈاکیے سے کہتے کہ یہ خط میرا نہیں، کسی اور غالب کا ہے اس روایت میں کہاں تک صداقت ہے، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ برصغیر میں ایک ہی ''غالب'' ہے اور وہ ہے ''میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی'' جو اپنے علم و فن شاعری کی بلندیوں کے سبب پورے جہان ادب پر چھایا ہوا ہے۔

آج تک ''غالب'' اور ان کے فن پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں زیر نظر کتاب ''غالب آگہی'' مرتبہ سید قدرت نقوی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے یہ نقوی صاحب کے خطوط (جو انہوں نے ''غالب شناسی'' کے لیے مولانا غلام

رسول مہر اور مولانا امتیاز علی عرشی کو لکھے) اور ان کے جواب میں ان دونوں بزرگوں کے خطوط کا مجموعہ ہے

"غالب" کے احوال و آثار اور ان کے کلام کی تشریح و توضیح کے بارے میں اہل علم و قلم کے مابین بحث و تمحیص کا سلسلہ بہت طویل ہے، اور بعض مقامات و معاملات پر نوبت قلمی جنگ و جدل کی بھی آ جاتی ہے ایسی صورت پیش آ جانے پر مولانا غلام رسول مہر کی یہ سطور پلے باندھ لینے کے قابل ہیں:

"اختلاف رائے عیب نہیں، اور اس پر اعتراض بھی نہیں ہو سکتا میرزا غالب معصوم نہ تھے کہ ان کی کسی لغزش کو تسلیم کرنے میں تامل کیا جائے۔۔۔۔" (ص 142-147)

کتاب میں ضمنی طور پر "غالب" کے احوال و آثار کے علاوہ دیگر علمی و تحقیقی گوشوں پر بھی مواد ملتا ہے، مثلاً ص 55 پر مولانا غلام رسول مہر کے ایک خط میں ایک وضاحت کے ضمن میں آیا ہے:

"الفاظ و محاورات کے علاوہ بعض اوقات نفس بیان بھی ایک خاص طبقے سے مخصوص ہوتا ہے، مثلاً "شاہنامہ" میں فردوسی نے جہاں رستم سپہ سالار ایران کی گفتگو عرب مسلمانوں کے نمائندوں سے نقل کی ہے، وہاں یہ بھی ملتا ہے"

ز شیر شتر خوردن و سوسمار

عرب را بہ جائے رسید است کار

کہ تخت کیاں را کنند آرزو

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

(یعنی اونٹنی کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عربوں کا معاملہ اب اس حد پر جا پہنچا ہے کہ کیانیوں کے تخت کی آرزو کرنے لگے ہیں)

مولانا شبلی مرحوم تک نے لکھا ہے کہ فردوسی نے یہاں اسلام کے خلاف ایرانیت کا تعصب ظاہر کیا، حالانکہ یہ فردوسی کی شاعری کا منتہائے کمال ہے اسے اپنے افکار و عقائد سے کوئی بحث نہیں صرف بولنے والے کے کردار اور دل و دماغ کے مکمل اظہار سے بحث ہے۔ رستم کی گفتگو ایسی ہی ہوسکتی تھی۔

مولانا غلام رسول مہر کی یہ وضاحت علمی حد تک قابل قبول سہی لیکن تاریخی شواہد اور ایران و عرب کے قدم روابط، اور فاتح و مفتوح کی حیثیت سے دو قوموں کے جذبات کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تحریر رائے سو فیصد درست ہے۔

زیر نظر کتاب جناب سید قدرت نقوی کی غالب سے محبت کا بین ثبوت ہے، اور یہ غالب اور ان کے فکر و فن کے شیدائیوں کے لیے ایک مرغوب تحفہ ہے ہم محترم مرتب اور محترم ناشر کو ایسی عمدہ کتاب شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نام کتاب: آتش زیر پا

مولف: آغا شیدا کاشمیری

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی برائے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی

صفحات: 280

قیمت: 75

مبصر: محمد نذیر رانجھا

کچھ لوگ محض مشغلے کے طور پر لکھتے ہیں، اور بعض حضرات کسی خاص مقصد کے تحت۔۔۔ لکھنے والا اگر اپنے شغل سے محبت رکھتا ہو تو اس کی تحریر وقت گزارنے کے علاوہ بھی مفید ثابت ہوتی ہے کسی خاص مقصد اور مشن کے تحت لکھی جانے والی تحریر تو ہوتی ہی بڑی مفید ہے، لیکن جب اس کے خمیر میں محبت و محنت کا عنصر شامل ہو تو وہ نہ صرف مفید تر ہو جاتی ہے بلکہ لکھنے والے کی زندگی میں اس کی شہرت کا ذریعہ اور اس کی موت کے بعد اسے زندہ رکھنے والی شے بن جاتی ہے

"آتش زیر پا" ایسے ہی ایک خاص مقصد و مشن کے تحت لکھی جانے والی کتاب ہے جسے آغا شیدا کاشمیری نے بڑی محبت اور محنت سے تالیف کیا ہے اس میں انہوں نے مشاہیر کے بچپن اور لڑکپن کے خودنوشت حالات کو جمع کیا ہے کل 36 شخصیات کے بچپن اور لڑکپن کے امٹ نقوش محفوظ ہیں جن میں ادباء، شعراء، محققین، صحافی، ادبی مدیران، فلاسفہ و ماہرین نفسیات اور سرپرستان علم و ادب

شامل ہیں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، اختر شیرانی، احسان دانش، نشتر جالندھری، خواجہ دل محمد، حاجی لق لق، نفیس خلیلی، احمد ندیم قاسمی، نظر زیدی، غلام رسول ازہر، آغا شیدا کاشمیری، سردار عبدالمجید لشاری، عظیم قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، عبداللہ قریشی، نصر اللہ خان عزیز، عبدالمجید سالک، آغا شورش کاشمیری، وقار انبالوی، ابوسعید بزمی، خلیل صحافی، ڈاکٹر تحسین فراقی، خواجہ افتخار، سر شیخ عبدالقادر، میاں بشیر احمد، سید امتیاز علی تاج، میرزا ادیب، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید عشرت، شیر محمد اختر، حکیم محمد سعید، حکیم محمد حسن قریشی اور ڈاکٹر عبدالوحید شامل ہیں ہر ایک کے حالات و واقعات اس قدر دلچسپ، سبق آموز اور قابل رشک ہیں جیسے کوئی وسیع سمندر ہیرے جواہرات سے اٹا پڑا ہو بطور نمونہ چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

1 ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے اپنے بچپن کے حالات میں لکھا ہے

"مجھے چاند سے بہت محبت ہے، رسمی شاعرانہ محبت نہیں، دلی محبت ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہے کہ جب میں تین سال کا تھا تو رات کے وقت 32 میل، ایک گاؤں سے لاہور، گھوڑے پر سوار ہو کر آیا چاند نکلا ہوا تھا اور سارا راستہ ساتھ ساتھ آ رہا تھا میں بار بار یہ پوچھتا تھا کہ چاند ہمارے ساتھ کیوں آ رہا ہے جس وقت میں یہ سفر کر رہا تھا، اس وقت میرے خاندان کے دو کے سوا تمام افراد طاعون میں مبتلا تھے انہوں نے وبا میں اپنی بستی کو چھوڑنا خلاف احکام رسول پاکؐ جانا، اور سب

نے جان دے دی، لیکن مجھے امانت سمجھ کر میرے گھر لاہور پہنچا دیا۔ مجھے یہ سفر نہیں بھولتا چاند آج بھی ویسا ہے، میں بدل گیا ہوں، لیکن لڑکپن کے بہت سے اثرات باقی ہیں''

(ص 15)

2 مولانا ظفر علی خان اپنے بچپن اور لڑکپن کے بارے میں رقم طراز ہیں

(الف) ''میری شادی بارہ برس کی عمر میں ہوگئی تھی جب بیوی گھر میں آئی تو میں ایک مدت تک یہی سمجھتا رہا یہ کوئی مہمان لڑکی آئی ہے۔''

(ب) ''کم عمری میں والد صاحب کے ساتھ کشمیر کے دورے پر جایا کرتا تھا تو نماز کے وقت برف توڑ کر اس سے وضو کرلیا کرتا تھا''

(ص 9)

3 احسان دانش لکھتے ہیں

''میری مزدوری مجھے معماری تک لے گئی، مگر اس میں مطالعے کی گنجائش اور اچھی سوسائٹی کا فقدان تھا مزدوروں سے میٹوں کا رویہ، معماروں سے بڑے مستری کا برتاؤ، ٹھیکیداروں کی شاطرانہ دولت سازی، یہ سب میرے دل میں کھٹکنے لگیں، اور اسی چیز نے بڑھتے بڑھتے نقاب کے وہ گوشے اٹھائے کہ میں انسانوں کے گروہ میں فرشتوں اور شیطانوں کی تمیز کرنے لگا''

(ص 21)

4 حاجی لق لق رقم طراز ہیں

''میں بچپن میں بہت ہی آرام طلب تھا رات کے وقت پیشاب
کی حاجت ہوتی تو بستر پر ہی دریا بہا دیتا سردی کے موسم میں کون اٹھے
اور باہر جا کر پیشاب کرے! میری ماں بہت نیک اور بردبار تھی، جب
وہ دیکھتی کہ میں نے پیشاب کر کے بستر کو گیلا کر دیا ہے تو بچاری مجھے
اٹھا کر اپنی دوسری طرف سلا لیتی اور خود گیلی جگہ پر کھسک جاتی میں تھا
بڑا شریر، وہاں بھی پیشاب کر دیتا مجھے ماں کا امتحان مدنظر ہوتا، لیکن
ماں اس امتحان میں ناکام ہونے والی کب تھی! مجھے اٹھا کر اپنے سینے پر
لٹا لیتی اور خود بحر قلزم میں پڑی رہتی''

(ص 31)

'' آتش زیر پا'' بار اول میں 1948ء میں طبع ہوئی، دوسری دفعہ مغربی
پاکستان اردو اکیڈمی نے اسے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے اتنے طویل عرصے میں
موئف کتاب اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو کرتے رہے، اور یوں در
حقیقت یہ ''گنج گرانمایہ'' بن گئی

ختم شد__________The End